فیض: انھیں دنوں انتظار حسین کا 'بستی' شائع ہُوا ہے۔ یہ نہایت خوب ناول ہے۔

س: بعض نقاد کہتے ہیں کہ 'بستی' نوسٹالجیا کا ناول ہے۔

فیض: ہے تو پھر؟ نوسٹالجیا ایک انسانی اور فطری کیفیت ہے۔ اس میں خرابی کیا ہے۔ اور یہ ناول محض ماضی کی آہ و بکا تو نہیں ہے۔ آج کے زمانے کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

س: بعض ترقی پسند نقادوں کو شکایت ہے کہ انتظار حسین جس طرح ماضی کو استعمال کرتا ہے وہ ایک مریضانہ صورت ہے۔

فیض: اس ناول میں تو ایسا نہیں ہے۔ مجھے یہ ناول پسند آیا۔ بہت دل آویز لگا۔

ہیرالڈ، کراچی (دسمبر ۱۹۸۲ء)
انٹرویوئر: آصف فرخی

بستی

(ناول)

انتظار حسین

سنگِ میل پبلی کیشنز ○ لاہور

عسکری صاحب کے نام

طبع دوم : ۱۹۸۳ء
تعداد : ایک ہزار
طابع : امپرنٹ، لاہور
ناشر : نیاز احمد
سنگِ میل پبلی کیشنز، چوک اُردو بازار، لاہور
قیمت : ۳۵/۰۰ روپے

۱

جب دنیا ابھی نئی نئی تھی، جب آسمان تازہ تھا اور زمین ابھی میلی نہیں ہوئی تھی، جب درخت صدیوں میں سانس لیتے تھے اور پرندوں کی آوازوں میں جگ بولتے تھے۔ کتنا حیران ہوتا تھا وہ ارد گرد کو دیکھ کر کہ ہر چیز کتنی نئی تھی اور کتنی قدیم نظر آتی تھی۔ نیل کنٹھ، کھٹ بڑھیا، مور، فاختہ، گلہری، طوطے جیسے سب اس کے سنگ پیدا ہوئے تھے، جیسے سب جگوں کے بھید سنگ لئے پھرتے ہیں۔ مور کی جھنکار لگتا کہ روپ نگر کے جنگل سے نہیں برندابن سے آرہی ہے۔ کھٹ بڑھیا اُڑتے اُڑتے اونچے نیم پہ اترتی تو دکھائی دیتا کہ وہ ملکہ سبا کے محل میں خط چھوڑ کے آرہی ہے اور حضرت سلیمان کے قلعے کی طرف جارہی ہے اور جب گلہری منڈیر پہ دوڑتے دوڑتے اچانک دُم پہ کھڑی ہو کے چک چک کرتی تو وہ اسے تکنے لگتا اور حیرت سے سوچتا کہ اس کی پیٹھ پہ پڑی یہ کالی دھاریاں رام چندر جی کی انگلیوں کے نشان ہیں اور ہاتھی تو حیرت کا ایک جہان تھا۔ اپنی ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر جب وہ اسے دور سے آتا دیکھتا تو بالکل ایسا لگتا کہ پہاڑ چلا آرہا ہے۔ یہ لمبی سونڈ، بڑے بڑے کان پنکھوں کی طرح ہلتے ہوئے تلوار کی طرح خم کھائے ہوتے دو سفید سفید دانت دو طرف نکلے ہوتے۔ اسے دیکھ کے وہ حیران اندر آتا اور سیدھا بی اماں کے پاس پہنچتا۔

"بی اماں، ہاتھی پہلے اُڑا کرتے تھے؟"

"ارے تیرا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔"

"بھگت جی کہہ رہے تھے۔"

"ارے اس بھگت کی عقل پہ تو پتھر پڑ گئے ہیں۔ لو بھلا لحیم شحیم جانور، وہ ہوا میں کیسے اُڑے گا۔"

"بی اماں ہاتھی پیدا کیسے ہوا تھا؟"

"کیسے پیدا ہوتا۔ میاں تے جنا پیدا ہو گیا۔"

"نہیں بی اماں، ہاتھی انڈے سے نکلا ہے۔"

"ارے تیری عقل چرنے تو نہیں گئی ہے؟"

"بھگت جی کہہ رہے تھے۔"

"بخت مارے بھگت کی تو مت ماری گئی ہے۔ اتنا بڑا جانور، ہاتھی کا ہاتھی، وہ انڈے میں سے نکلے گا۔ نکلنا تو بعد کی بات ہے، اس میں سمائے گا کیسے۔"

مگر ہمیں بھگت جی کے علم پہ بہت اعتبار تھا۔ گلے میں جنیو، ماتھے پہ تلک، چوٹی کو چھوڑ کر سارا سر گھٹا ہوا۔ نون تیل کی دکان پہ بیٹھے نون تیل بھی بیچتے جاتے اور رامائن اور مہا بھارت میں لکھی ہوئی حکمتیں بھی سناتے جاتے۔ لڑکے بالے شور مچا رہے ہیں "بھگت جی ڈیڑھ پیسے کی سانبھر، بھگت جی دھیلے کا گڑ۔"

"بالکو رول مت مچاؤ۔ دھیرج سے کام لو۔" کہتے کہتے سانبھر تولتے، گڑ دیتے اور پھر وہیں سے جہاں سے چھوڑا تھا سرا پکڑ لیتے۔ "بالکو، برہماں جی نے یہ دیکھا تو شیش سے کہا کہ دیکھ شیش دھرتی اس سمے ادھک ڈانواڈول ہے۔ تو واکی سہاتا کر۔ شیش بولا مہاراج واکو اُٹھا کے مو کے پھن پہ رکھ دو، پھر وہ ٹک جاوے گی۔ برہماں جی بولے کہ شیش تو دھرتی کے بھیتر چلا جا۔ شیش نے دھرتی میں ایک چھید دیکھا۔ وا میں سٹک گیا۔ دھرتی تلے پہنچ کے پھن پھیلایا اور دھرتی کو پھن پہ ٹکا لیا۔ کچھوے نے یہ دیکھا تو واکو چنتا ہوئی کہ شیش کی پونچھ تلے تو پانی ہی پانی ہے۔ وا نے شیش کی پونچھ تلے جا کے سہارا دیا۔ سو بالکو دھرتی شیش جی کے پھن پہ ٹکی ہوئی ہے۔ شیش جی کچھوے کی پیٹھ پہ ٹکے ہوئے ہیں۔ جب کچھوا ہلے ہے تو شیش جی ہلتے ہیں۔ جب شیش جی ہلتے ہیں تو دھرتی ہلے ہے اور بھونچال آوے ہے۔"

مگر ابا جان زلزلے کی وجہ کچھ اور ہی بتاتے تھے۔ حکیم بندے علی اور مصیب حسین روز اس کے بڑے کمرے میں آ کر بیٹھتے جس کے بیچوں بیچ جھالر والا پنکھا لٹک رہا تھا اور اونچی چھت کے برابر چاروں طرف کنگنی بنی تھی۔ جہاں کسی جنگلی کبوتروں کے جوڑے نے، کسی فاختہ نے، کسی گرگٹ نے اپنا اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔ دونوں ابا جان سے کتنے مشکل مشکل سوال کرتے تھے اور ابا جان بلا تامل قرآن کی آیتیں پڑھ کر اور حدیثیں سنا کر سوالوں کے جواب دیتے تھے۔

"مولانا! اللہ تعالےٰ نے زمین کو کیسے پیدا کیا؟"

تھوڑا تامل، پھر جواب "سوال کیا جابر بن عبداللہ انصاری نے کہ قربان ہوں ہمارے ماں باپ حضور پہ سے، زمین کو اللہ تبارک و تعالےٰ نے کس شے سے ترکیب دیا۔ فرمایا سمندر کے پھینے سے۔ پوچھا سمندر کا پھینا کس چیز سے بنایا؟ فرمایا؟ موج سے۔ پوچھا، موج کس چیز سے نکلی؟ فرمایا، پانی سے۔ پوچھا، پانی کہاں سے نکلا؟ فرمایا، دانۂ مروارید سے۔ پوچھا، دانۂ مروارید کہاں سے نکلا؟ فرمایا، تاریکی سے۔ تب کہا جابر بن عبداللہ انصاری نے کہ صدقت یا رسول اللہؐ۔"

"مولانا زمین کس چیز پہ قائم ہے؟"

پھر دم بھر کے لئے تامل۔ پھر اسی خوش اسلوبی سے جواب "سوال کیا سوال کرنے والے نے کہ قربان ہوں یا حضرت میرے ماں باپ آپ پہ سے۔ زمین کو قرار کس سے ہے؟ فرمایا، کوہِ قاف سے۔ پوچھا کوہِ قاف کے گرداگرد کیا ہے؟ فرمایا سات زمینیں۔ پوچھا سات زمینوں کے گرد کیا ہے؟ فرمایا، اژدہا۔ پوچھا اژدہے کے گرد کیا ہے؟ فرمایا، اژدہا۔ پوچھا، زمین کے نیچے کیا ہے؟ فرمایا گائے جس کے چار ہزار سینگ ہیں اور ایک سینگ

سے دوسرے سینگ تک کا فاصلہ پانچسو برس کے سفر کا ہے۔ یہ سات طبق زمین کے اس کے دو سینگوں پر ٹکے ہوئے ہیں اور مچھر ایک اس گائے کے نتھنوں کے روبرو بیٹھا ہے۔ کہ خوف سے اس کے وہ جنبش نہیں کر سکتی۔ بس سینگ ہلتی ہے کہ اس سے زلزلہ آتا ہے۔ پوچھا، کھڑی ہے وہ کس چیز پہ؟ فرمایا مچھلی کی پشت پہ۔ تب قائل ہوا سوال کرنے والا اور بولا صدقت یارسول اللہؐ۔"

ابا جان چپ ہوئے۔ پھر بولے "حکیم صاحب! اس دنیا کی حقیقت بس اتنی ہے کہ ایک مچھر گائے کے نتھنوں کے روبرو بیٹھا ہے۔ مچھر ہٹ جائے تو پھر دنیا کہاں ہوگی۔ تو ہم ایک مچھر کے رحم و کرم پہ ہیں، مگر نہیں جانتے اور غرور کرتے ہیں۔"

روز یہی باتیں، روز یہی کہانیاں جیسے بھگت جی اور ابا جان مل کر اس کے لئے کائنات کی تفسیر کر رہے تھے۔ یہ باتیں سن سن کر اس کے تصوّر میں دنیا کی ایک تصویر بن گئی تھی۔ دنیا تو خیر پیدا ہو گئی مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ روئیں بہت بی بی حوا۔ پیدا ہوئی ان کے آنسوؤں سے مہندی اور سرمہ۔ مگر پیٹ سے پیدا ہوئے ہابیل اور قابیل دو بیٹے اور اقلیما ایک بیٹی چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ بیاہ دیا باپ نے بیٹی کو چھوٹے بیٹے ہابیل سے۔ تس پہ غصہ کھایا بڑے بیٹے قابیل نے اور پتھر اُٹھا کے مارا ہابیل کو کہ مر گیا وہ اس سے۔ تب اُٹھائی قابیل نے ہابیل کی لاش اپنے کاندھے پہ اور چکر کاٹا پوری زمین کا۔ اور گرا جس جس مقام پہ خونِ ہابیل کا، ہو گئی اس اس جگہ پہ زمین شور۔ تب سوچ میں پڑ گیا قابیل کہ کروں کیا بھائی کی لاش کا کہ دکھنے لگے تھے لاش کے بوجھ سے اس کے کندھے۔ دیکھا اُس گھڑی اس نے دو کوؤں کو کہ لڑ رہے تھے آپس میں اور مار ڈالا ایک نے دوسرے کو۔ کھودی مارنے والے نے اپنی منقار سے زمین اور گاڑ کر اس میں مقتول کو جا بیٹھا درخت پہ۔ تب افسوس کیا قابیل نے کہ اے خرابی میری، نہ ہو سکا مجھ سے اتنا کہ ہوؤں برابر کوے کے اور کروں دفن اپنے برادر کو۔ تب دفن کیا بھائی نے بھائی کو کوے کی مثال پہ۔ سو وہ تھی پہلی قبر کہ بنی روئے زمین پہ

اور تھا وہ پہلا خون آدمی کا کہ ہوا آدمی کے ہاتھوں اور تھا وہ پہلا بھائی کہ مارا گیا بھائی کے ہاتھوں ——— اس نے پیلے ورقوں والی وہ کتاب بند کر کے ابا جان کی کتابوں کی الماری میں اسی جگہ رکھ دی جہاں سے اُٹھائی تھی، پھر بی اماں کے پاس پہنچا۔

"بی اماں! ہابیل قابیل کا بھائی تھا؟"

"ہاں بیٹے! ہابیل قابیل کا بھائی تھا۔"

"پھر ہابیل کو قابیل نے قتل کیوں کیا؟"

"کھودا خون جو سفید ہو گیا تھا۔"

اس نے یہ سنا اور حیران ہوا، مگر اب اس کی حیرت میں ہلکا سا ڈر بھی شامل تھا۔ حیرت کے تجربوں میں خوف کی پہلی لہر۔ وہ اُٹھ کے بڑے کمرے میں گیا جہاں حسبِ دستور حکیم بندے علی اور مصیب حسین بیٹھے ابا جان سے سوال کر رہے تھے اور جواب سن رہے تھے۔ مگر اس وقت ابا جان دنیا کے آغاز سے زقند بھر کر دنیا کے انجام پہ پہنچ چکے تھے۔

"مولانا قیامت کب آئے گی؟"

"جب مچھر مر جائے گا اور گائے بے خوف ہو جائے گی۔"

"مچھر کب مرے گا اور گائے کب بے خوف ہو گی؟"

"جب سورج مغرب سے نکلے گا۔"

"سورج مغرب سے کب نکلے گا؟"

"جب مرغی بانگ دے گی اور مرغا گونگا ہو جائے گا۔"

"مرغی کب بانگ دے گی اور مرغا کب گونگا ہو گا؟"

"جب کلام کرنے والے چپ ہو جائیں گے اور جوتے کے تسمے باتیں کریں گے۔"

"کلام کرنے والے کب چپ ہو جائیں گے اور جوتے کے تسمے کب باتیں کریں گے"

"جب حاکم ظالم ہو جائیں گے اور رعایا خاک چاٹے گی۔"

ایک جب کے بعد دوسرا جب، دوسرے جب کے بعد تیسرا جب، جبوں کا عجب چکر تھا۔ جب جو گزر گئے، جب جو آنے والے تھے۔ کب کب کے جب بھگت جی کو یاد تھے، کب کب کے جب ابا جان کے تصور میں منور تھے۔ ایسے لگتا کہ دنیا جبوں کا بے انت سلسلہ ہے، جب اور جب اور جب ــــــ مگر اب تصور کی ڈوری اچانک سے ٹوٹ گئی۔ باہر بلند ہوتے نعروں کا شور اچانک اندر آیا اور اس کی یادوں کی لڑی کو تتر بتر کر گیا۔

اس نے اُٹھ کر دریچے سے جھانکا اور سامنے والے میدان پہ کہ کچھ دنوں سے جلسہ گاہ بنا ہوا تھا، ایک نظر ڈالی اور ان گنت سروں کو گڈمڈ دیکھا۔ جلسہ گرم تھا اور اچانک نعرے لگنے شروع ہو گئے تھے۔ دریچہ بند کر کے پھر کرسی پہ آ بیٹھا تھا اور کتاب کو الٹ پلٹ کر کے دیکھنا اور جہاں تہاں سے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ آخر صبح کے لئے لیکچر بھی تو تیار کرنا تھا مگر کھڑکی بند ہو جانے کے باوجود نعروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ گھڑی دیکھی، گیارہ بج رہے ہیں۔ جلسہ اب شروع ہوا ہے۔ تو پتہ نہیں ختم کب ہوگا؟ کہیں پھر وہی کل کا چکر شروع نہ ہو جائے اور رات کی نیند حرام ہو جائے۔ آج کل تو جلسوں میں یہی ہوتا ہے۔ گالی سے شروع ہوتے ہیں اور گولی پر ختم ہوتے ہیں۔ مگر کمال ہے وہ اپنے آپ پہ حیران ہونے لگا باہر جتنا ہنگامہ بڑھتا جاتا ہے، میں اندر سمٹتا جاتا ہوں۔ کب کب کی یادیں آ رہی ہیں۔ اگلے پچھلے قصے، بھولی بسری باتیں۔ یادیں ایک کے ساتھ دوسری، دوسری کے ساتھ تیسری اُلجھی ہوئی، جیسے آدمی جنگل میں چل رہا ہو۔ میری یادیں میرا جنگل ہیں۔ آخر یہ جنگل شروع کہاں سے ہوتا ہے۔ نہیں، میں کہاں سے شروع ہوتا ہوں اور وہ پھر جنگل میں تھا۔ جیسے جنگل کی انتہا تک پہنچنا چاہتا ہو، جیسے اپنا شروع تلاش کر رہا ہو۔ اندھیرے میں چلتے چلتے کوئی منور منطقہ آتا تو ٹھٹھکتا مگر پھر آگے بڑھ جاتا کہ وہ تو اس ساعت تک پہنچنا چاہتا تھا جب اس کے شعور نے آنکھ کھولی تھی۔ مگر وہ ساعت اُس کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔ جب کسی یاد پہ انگلی رکھی تو اس کے عقب میں یادوں کے دل بادل منڈلاتے نظر آئے۔ پھر وہ بول

چلا کہ اس کی یاد کے حساب سے روپ نگر میں سب سے پہلے کون سا واقعہ ہوا تھا۔ مگر اس بستی کا ہر عمل صدیوں میں پھیلا نظر آیا۔ روز و شب کا قافلہ وہاں کتنا آہستہ گزرتا تھا جیسے گزر نہیں رہا، رکا کھڑا ہے۔ جو شے جہاں آ کر ٹھہر گئی سو بس ٹھہر گئی۔ جب بجلی کے کھمبے پہلی پہل آئے تھے اور سڑکوں پہ جہاں تہاں ڈالے گئے تھے تو یہ کتنا انقلابی واقعہ نظر آتا تھا۔ پورے روپ نگر میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔ لوگ چلتے چلتے ٹھٹھکتے، سڑکوں کے کنارے پڑے ہوئے لمبے آہنی کھمبوں کو حیرت سے دیکھتے۔

"تو روپ نگر میں بجلی آ رئی اے؟"

"ہیے۔"

"میرے سر کسوں؟"

"تیرے سر کسوں۔"

دن گزرتے گئے، تجسس کم ہوتا گیا۔ کھمبوں پر گرد کی تہیں جمتی چلی گئیں۔ رفتہ رفتہ ان پر اتنی ہی گرد جم گئی جتنی ان کنکروں کی ڈھیریوں پہ جو کسی پہلے وقت میں سڑکوں کی مرمت کے لئے یہاں ڈالی گئی تھیں۔ مگر پھر ڈالنے والوں نے انہیں فراموش کر دیا اور وہ روپ نگر کی گرد میں اٹے لینڈ سکیپ کا حصہ بن گئیں۔ اب یہ کھمبے بھی اس گرد میں اٹے لینڈ سکیپ کا حصہ تھے۔ لگتا کہ سدا سے یہاں پڑے ہیں، سدا یہاں پڑے رہیں گے۔ بجلی کی بات آئی گئی ہو چکی تھی۔ روز شام پڑے لالٹین جلانے والا کاندھے پہ سیڑھی رکھے ہاتھ میں تیل کا کپا لئے نمودار ہوتا اور جا بجا لکڑی کے ستونوں پہ نصب اور دیواروں کی بلندی پہ ٹھکی ہوئی لالٹینوں کو روشن کرتا چلا جاتا۔ بسے رہی وسنتی سنجا ہو گئی۔ دیا بال دے،" وسنتی سانولی رنگت، بھولی صورت، ماتھے پہ بندیا، ملی دلی ساڑھی، ننگے پیروں، چھپ چھپ کرتی ڈیوڑھی پہ آتی۔ طاق میں رکھے دیے میں تیل بتی ڈال کے جلاتی اور اُلٹے پیروں اندر چلی جاتی، بغیر اُس کی طرف دیکھے ہوئے کہ وہ اپنی ڈیوڑھی پہ کھڑا اسے تکتا رہتا۔ چھوٹی بندیا

بس بھگت جی بیلے چیکٹ ڈیوٹ پر رکھے دیے میں ایک پلی کڑوا تیل ڈال کے اسے جلاتے اور سمجھ لیتے کہ ان کی دکان منور ہو گئی۔ انہیں کی دکان آگے نالی کے آگے مٹر و مشال جلا کر خوانچے کے برابر گاڑ دیتا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد آواز لگاتا "سونٹھ کے تیل شے"، مگر سب سے تیز روشنی لالہ ہردیال صراف کی دکان پہ ہوتی جہاں چھت میں لٹکے ہوئے لیمپ کی روشنی دکان سے نکل کر سڑک پہ تھوڑا اُجالا کر دیتی۔ روشنی کی پونجی اس نگر میں بس اتنی ہی تھی اور یہ بھی کتنی دیر۔ دکانیں ایک، ایک کر کے بند ہوتی چلی جاتیں۔ ڈیوٹ چھبوں کے طاقوں میں جھلملاتے دیئے مندے ہوتے چلے جاتے اور آخر کو بجھ جاتے۔ پھر بس کسی کسی نکڑ پہ لکڑی کے ستون پر نصب لالٹین ٹمٹماتی رہ جاتی۔ باقی اندھیرا ہی اندھیرا۔ یوں اس اندھیرے میں دیکھنے والی آنکھوں کو بہت کچھ نظر آتا۔

"بی اماں! یہ پچھلی جمعرات کی بات ہے۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ چوپال کے پاس سے گزری تو ایسے لگا جیسے کوئی عورت رو رہی ہے۔ ادھر دیکھا اُدھر دیکھا، کوئی بھی نئیں۔ چوپال کے پھاٹک کے پاس ایک کالی بلی بیٹھی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے اسے دھتکار دیا۔ آگے جو گئی تو اسے میں کیا دیکھوں ہوں کہ نیم والی بوا کی دیوار پہ وہی بلی۔ میں نے پھر اسے دھتکارا۔ وہ دیوار سے اندر کو دگئی۔ آگے چل کے اونچے کنویں والی گلی سے نکلی تو اسے بی اماں یقین کرو پھر وہی بلی۔ لالہ ہردیال کے چبوترے پہ بیٹھی ایسے رو رہی تھی۔ جیسے عورت رو رہی ہو۔ میرا جی سن سے رہ گیا۔"

"اللہ بس اپنا رحم کرے۔" بی اماں نے تشویش سے کہا اور چپ ہو گئیں۔ مگر رحم کہاں۔ اس کے دوسرے تیسرے دن شریفن نے آ کر دوسری خبر سنائی:

"اے بی اماں! محلے میں چوہے بہت مر رہے ہیں۔"

"اچھا؟"

"ہاں، میں گھوسی کی طرف سے گزری تو دیکھا کہ ڈھیروں مرے پڑے ہیں۔"

پہلے چوہے مرے، پھر آدمی مرنے لگے۔ باہر سے آتی ہوئی آواز رام نام ستیہ ہے ——

"ارے شریفن دیکھ تو سہی کون مرگیا۔"

"بی اماں! پیارے لال کا پوت جگدیش مرگیا۔"

"ہئے ہئے! وہ تو کڑیل جوان تھا کیسے مرگیا۔"

"بی اماں اس کے گلٹی نکلی تھی۔ گھنٹوں میں چٹ پٹ ہو گیا۔"

"گلٹی؟ ارے کمبخت کیا کہہ رہی ہے۔"

"ہاں بی اماں! سچ کہہ رہی ہوں۔ طاعون ——"

"بس بس زبان بند کر۔ بھرے گھر میں اس ستیاناسی بیماری کا نام نہیں لیا کرتے۔"

گلٹی جگدیش کے نکلی، پھر نیپڈت ہردیال کے نکلی، پھر مصرا جی کے نکلی۔ پھر لوگوں کے نکلتی ہی چلی گئی۔ جنازہ ایک گھر سے نکلا، پھر دوسرے گھر سے نکلا، پھر گھر گھر سے نکلا۔ بی اماں نے اور شریفن نے مل کر دس تک گنتی گنی۔ پھر وہ گڑبڑا گئیں۔ ایک دن میں کتنے گھروں سے جنازے نکل گئے۔ شام ہوتے ہوتے گلی کوچے سنسان ہو گئے۔ نہ قدموں کی آہٹ نہ ہنستے بولتے لوگوں کی آوازیں۔ اور تو اور آج جرنجی کے ہارمونیم کی بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی جو جاڑے، گرمی، برسات روز رات کو بیٹھک میں ہارمونیم کو لے کے بیٹھ جاتا اور تان لگاتا:

لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بن میں

لیلیٰ موری بسی مورے من میں

جب صبح ہوئی تو بستی کا رنگ ہی اور تھا۔ کوئی کوئی دکان کھلی تھی، باقی سب بند کچھ گھروں میں تالے پڑ گئے تھے، کچھ میں پڑ رہے تھے۔ کسی گھر کے سامنے بیلی کھڑی تھی، کسی گھر کے سامنے اکہ۔ لوگ جا رہے تھے۔ نگر خالی ہو رہا تھا۔ نگر دونوں طرح خالی ہوا۔ کچھ نگر سے نکل گئے، کچھ دنیا سے گزر گئے۔

"بی اماں! ہندو زیادہ مر رہے ہیں۔"

"بی بی ہیضے میں مسلمان مرتے ہیں، طاعون میں ہندو مرتے ہیں۔"

مگر پھر طاعون نے ہندو مسلمان میں امتیاز ختم کر دیا۔ کلمے کی آوازوں کے جلو میں نکلتے ہوئے جنازے بھی زور پکڑ گئے۔

"بھو! ذاکر کو روک کے رکھو۔ یہ بار بار باہر جاتا ہے۔"

"بی اماں! یہ لڑکا میری نہیں سنتا۔"

"اچھا اب نکل کے دیکھے، اس کی ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

مگر کسی دھمکی نے اس پر اثر نہیں کیا۔ رام نام ستیہ کی آواز آئی۔ اور وہ زن سے باہر ڈیوڑھی پر۔ جنازہ جب گزر جاتا تو سوگوار عورتیں اپنا دامن سنبھالے بین کرتی ہوئی گزرتیں۔ ان کے گزر جانے کے بعد سڑک کتنی ویران نظر آتی تھی۔ شریفن دوڑی ہوئی آتی اور اسے پکڑ کر اندر لے جاتی۔

کھٹ کھٹ کرتی ایک بیلی آئی اور ڈیوڑھی کے آگے آکر کھڑی ہو گئی۔

"ارے شریفن دیکھ تو سہی، ان قیامت کے دنوں میں کون مہمان آیا ہے۔"

شریفن گئی اور آئی۔

"بی اماں! دانپور سے ماموں ابا نے بیلی بھیجی ہے۔ کہلوایا ہے کہ سب کو لے کر نکل آؤ۔"

بی اماں سیدھی بڑے کمرے میں گئیں جہاں ابا جان سب سے الگ دن دن بھر مصلے پہ بیٹھے رہتے۔

"بیٹے ناصر علی! تمہارے ماموں ابا نے بیلی بھیجی ہے۔"

ابا جان نے تامل کیا۔ پھر بولے:

"بی اماں! حضور رسالت مآب نے فرمایا کہ جو موت سے بھاگتے ہیں وہ موت ہی کی طرف بھاگتے ہیں۔"

بیلی خالی آئی تھی، خالی واپس گئی اور ابا جان نے چینی کی پیالی میں زعفران گھولا، قلم پاک کر کے اس میں ڈبویا اور ایک دبیز کاغذ پر جلی حروف میں لکھا:

"لی خمسۃ اطفی بہا حر الوباء الحاطمہ المحمد والفاطمہ

والحسن والحسین یا علی یا علی یا علی"

پھر یہ کاغذ ڈیوڑھی پر جا کر پھاٹک پہ چپکایا اور واپس مصلے پہ آ بیٹھے۔

ڈاکٹر جوشی کا شفاخانے سے نکلنا اور کسی کے گھر پہ پہنچنا پہلے ایک واقعہ ہوا کرتا تھا۔ مگر اب تو ڈاکٹر صاحب وقت بے وقت گلی میں آن ڈلے نمودار ہوتے۔ کبھی اس گلی میں کبھی اُس گلی میں۔ ڈاکٹر صاحب روپ نگر کے مسیحا تھے۔ کہنے والے کہتے تھے کہ ان کے مقابلے کا ڈاکٹر دلی کے بڑے ہسپتال میں بھی نہیں ہے۔ لیکن اب مسیحا کا زور گھٹ رہا تھا، موت کا زور بڑھ رہا تھا۔ خود ڈاکٹر صاحب کی بیوی کے گلٹی نکلی اور ڈاکٹر صاحب کے دیکھتے دیکھتے پران چھوڑ گئی۔

"ڈاکٹر کی بھی بیر مر گئی۔"

"ہیں!"

بھگت جی کی دکان پہ بیٹھے لوگ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ چرونجی مل وید کی دوا اور حکیم بندے علی کی حکمت سے پہلے ہی پہلے میں اعتبار اُٹھ گیا تھا۔ اب ڈاکٹر جوشی کی مسیحائی بھی اپنا اعتبار کھو بیٹھی۔ موت اب ایک اٹل حقیقت تھی۔ مرنے والے خاموشی سے مر رہے تھے۔ جنازہ اُٹھانے والے تھکے تھکے نظر آتے۔

وہ خود کتنا تھک گیا تھا۔ جنازہ گزر جاتا اور وہ اسی طرح کھڑا رہتا اور خالی سڑک کو تکتا رہتا۔ اس کے گھر کے سامنے کی سڑک اب کتنی ویران نظر آتی تھی۔ دکانوں اور مکانوں میں بالعموم تالے پڑے تھے۔ وسنتی کے گھر کے دروازے میں تالا پڑ چکا تھا۔ کسی کسی دکان

کا پٹ کسی وقت تھوڑا کھلا نظر آتا، پھر جلد ہی بند ہو جاتا۔ وہ مقفل دروازوں، بند کواڑوں اور سونی سڑک کو دیکھ دیکھ کے تھک جاتا اور شریفن کے تقاضے سے پہلے ہی واپس اندر چلا جاتا جہاں ایک خاموشی سی چھائی رہتی۔ ابا جان سب سے الگ موت و زیست کے معاملات سے بے نیاز مصلے پہ بیٹھے تسبیح پھیرتے رہتے۔ بی اماں پلنگ پہ بیٹھی کچھ سیتی پروتی رہتیں۔ اکا دکا بات اسی سے یا شریفن سے۔ اب حیرت ان کی آنکھوں سے رخصت ہو چکی تھی حیرت بھی اور خوف بھی۔ دوسری آنکھوں میں بھی اب نہ حیرت تھی نہ خوف۔ وبا کو جیسے ایک قائم و دائم حقیقت کے طور پر سب نے قبول کر لیا تھا۔ ہاں مگر ایک روز بی اماں صبح کو اس طور جاگیں کہ بدن ان کا کانپ رہا تھا۔ اسی عالم میں انہوں نے نماز پڑھی اور دیر تک سجدے میں پڑی رہیں۔ جب سجدے سے سر اٹھایا تو جھریوں بھرا چہرہ آنسوؤں میں تر بتر تھا۔ پھر انہوں نے آنچل منہ پر رکھ کر ہلکی ہلکی آواز کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔ ابا جان نے مصلے پہ بیٹھے بیٹھے غور سے بی اماں کو دیکھا۔ اُٹھ کر قریب آئے "بی اماں! کیا بات ہے؟"

"بیٹے امام کی سواری آئی تھی۔" رکیں، پھر بولیں "ایسی روشنی جیسے گیس کا ہنڈا جل گیا ہو۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہے کہ مجلس کرو۔"

ابا جان نے تامل کیا۔ پھر کہا:

"بی اماں! آپ کو بشارت ہوئی ہے۔"

بشارت کی خبر شریفن کی زبانی گھر گھر پہنچی۔ ہر اس گھر سے جس میں تالا نہیں پڑا تھا۔ بیبیاں آئیں۔ مجلس ہوئی اور بہت رقت ہوئی۔

"اے بی اماں! آپ نے کچھ سُنا۔ نحوست ماری بیماری ٹل گئی۔"

"اری سچ کہہ۔"

"ہاں بی اماں! ڈانکٹر جوشی نے بتایا ہے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔" اور بی اماں کی آنکھوں میں پھر آنسو امنڈ آئے۔ جب سجدے سے

انہوں نے سر اٹھایا تو جھریوں بھرا چہرہ پھر آنسوؤں میں تر بتر تھا۔

بیبیاں جس طرح لدی پھندی گئی تھیں اسی طرح لدی پھندی واپس آئیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک نیا اکہ چرخ چوں کرتا آتا اور ایک اور مقفل گھر کھل جاتا۔ مقفل مکان کھل رہے تھے اور گھر کے اندر کے چیتھڑے گودڑے باہر ڈھیر لگا کر جلائے جا رہے تھے۔

اب شام تھی۔ دور وسنتی کے گھر کے آنگن سے دھات کے چھوٹے بڑے برتنوں کی کھنکھناہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ مندر سے آتی گھنٹیوں کی آوازوں کے بیچ ایک مانوس آواز سنائی دی "ہے ری وسنتی، سنجا ہو گئی، دیا بال دے" اور وسنتی اسی طور ننگے پیروں ڈیوڑھی پہ آئی، نئے دیوے میں نئی بتی ڈال کر جلائی۔ واپس جانے لگی تھی۔ کہ سڑک پار کر کے وہ اس کے قریب گیا "وسنتی!"

وسنتی نے مڑ کر اسے دیکھا اور مسکرائی۔

"آ گئی تو؟"

"ہمیے۔"

وہ اور قریب آ گیا۔ اس کی ننگی باہیں ہولے سے چھوتے ہوئے نرم میٹھے لہجے میں بولا۔

"آ کھیلیں۔"

وسنتی ٹھٹکی۔ پھر ایک ساتھ بھڑکی "چل مسلے کے چھورے" اور بھاگ کر اندر چلی گئی۔

وسنتی سے بھڑکی کھا کر خوشی سے سرشار وہ واپس گھر گیا اور دیر تک اپنی پوروں میں مٹھاس گھلتی محسوس کرتا رہا۔

بے آباد گھر پھر سے آباد ہو گئے تھے اور چھدی بزریا میں پھر ویسی ہی گہما گہمی تھی۔ پھر بھی اب جہاں تہاں کھاپچے نظر آتے اور چہرے یہاں وہاں سے کم دکھائی دیتے۔ پنڈت ہرپال اپنے گھر کے چبوترے پہ اور مصراجی اپنی دکان کی مسند پہ کہاں دکھائی دیتے تھے اور جگدیش کہاں

تھا جو روز رات کو چرنجی کی بیٹھک میں جا کر ہارمونیم سیکھتا تھا۔ پنڈت ہر دیال کے بیٹے سوہن کا گھٹا ہوا سر ہفتوں اعلان کرتا رہا کہ وہ باپ کے سوگ میں ہے۔ مگر پھر سوہن کے سر پہ بال آتے چلے گئے اور چھوٹی بزریا کے کھانچے بھرتے چلے گئے۔ پھر اتنے ہی لوگ جیسے کوئی کم نہیں ہوا ہے اور ویسی ہی رونق جیسے یہاں کوئی واقعہ نہیں ہوا ہے۔ چرنجی کی بیٹھک میں پھر بھیڑ جمنے لگی تھی۔ آدھی آدھی رات تک ہارمونیم بجتا اور گانے کی آواز دور تک جاتی؛

رات پھر لیلیٰ پڑی رہتی ہے یوں
اپنے پہلو میں دبائے دردِ دل
دردِ دل بھی کیا کوئی معشوق ہے
جس کو دیکھو مبتلا ہے دردِ دل

"چرنجی سالے تیرے تو مزے ہو گئے۔"

"کیسے؟"

"کھمبا تیری بیٹھک کے بالکل برابر کھڑا ہوا ہے۔ سالے تو تو اب بجلی کی روشنی میں ہارمونیم بجایا کرے گا۔"

کھمبے کہ ایک زمانے سے گڑھوں میں رلے ملے پڑے تھے، اچانک کھڑے ہو گئے تھے۔ لوگ چلتے چلتے ٹھٹھکتے، نظریں اٹھا کر اونچے کھمبوں کو دیکھتے اور آنے والی نئی روشنی کا تصور کر کے دنگ رہ جاتے۔

"کہویں ہیں کہ بجلی میں بہت روشنی ہووے ہے۔"

"بس ایسا سمجھ لو کہ دن نکلا ہوا ہے۔"

"بھئی انگریز بھی کمال ہے۔"

مگر مزدور کھمبوں کو کھڑا کر کے پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دن گزرتے، ہفتے گزرتے، پھر وقت گزرتا ہی چلا گیا۔ کھمبے گرد آلود ہو کر پھر لینڈ سکیپ کا حصہ بن گئے۔ لگتا تھا کہ

گاڑے نہیں گئے ہیں، زمین سے اُگے ہیں۔ اُڑتے اُڑتے کوئی فاختہ، کوئی کھٹ بڑھیا دم بھر کے لیے کسی کھمبے پہ اترتی۔ مگر شاید اس کی آہنی صورت سے بیزار ہو کر جلدی اُڑ جاتی۔ ہاں کوئی چیل آ بیٹھتی تو دیر تک بیٹھی رہتی۔ مگر چیلیں مٹیوں پہ بیٹھنا زیادہ پسند کرتی تھیں۔ چوپال کی اونچی مٹی پہ جو چیل آ بیٹھتی وہ پھر بیٹھی ہی رہتی۔ لگتا کہ جگ بیت جائے گا اور وہ یہاں سے نہیں اُڑے گی۔ یہ مٹی کچھ امتدادِ زمانہ سے پرانی ہوئی، کچھ چیلوں کی بیٹوں نے اسے پرانا بنا دیا۔ مگر بڑی حویلی کی برجیاں پرانی ہونے سے پہلے ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ یہ بندروں کا کارنامہ تھا۔

بات یہ ہے کہ جس طرح چیل ہر مٹی پہ نہیں بیٹھتی اسی طرح بندر بھی ہر منڈیر پہ نہیں دندناتے۔ اس نگر کی کچھ مٹیاں چیلوں کو بھا گئی تھیں، کچھ منڈیریں بندروں کو پسند آ گئی تھیں۔ بندروں کا عجب طور تھا۔ آتے تو آتے ہی چلے جاتے۔ جاتے تو اس طرح جاتے کہ کوٹھوں پہ تو کیا کہ بلا کے پاس والی املیوں پہ بھی نظر نہ آتے۔ چھتیں سنسان، منڈیریں ویران۔ صرف اونچے کوٹھوں کی شکستہ برجیاں یہ یاد دلاتیں کہ یہ اونچے کوٹھے کبھی بندروں کی زد میں تھے۔ مگر اس شام کیا ہوا تھا۔ گلی سے گزرتے گزرتے اُسے ایسا لگا جیسے اس کے سر پہ ایک منڈیر سے مقابل والی منڈیر پہ کوئی کودا ہے۔ نظر اُٹھائی تو کیا دیکھا کہ بندروں کی ایک قطار منڈیر منڈیر چلی جا رہی ہے۔ "ارے بندر۔" اس کے منہ سے نکلا اور دل دھک سے رہ گیا اور دوسرے دن جب وہ صبح کو سو کر اُٹھا تو گھر میں اور گھر سے باہر شور مچا ہوا تھا۔ آنگن میں رکھی ہوئی چیزیں یا ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں یا غائب ہو گئی تھیں۔ ایک بندر امی کا دوپٹہ لے اُڑا تھا اور سب سے اونچے والے کوٹھے کی منڈیر پہ بیٹھا اسے دانتوں میں دبا کر لیر لیر کر رہا تھا۔

بندر جانے کس کس بستی سے کس کس جنگل سے چل کر آئے تھے۔ ایک قافلہ، دوسرا قافلہ، قافلہ کے بعد قافلہ۔ ایک منڈیر سے دوسری منڈیر پہ، دوسری منڈیر سے تیسری منڈیر پہ۔ بھرے آنگنوں میں لپک جھپک اترتا، چیزوں کو اچک یہ جا وہ جا۔ نتو اتیلی

نے چندہ جمع کر کے چنے خریدے اور گڑ کی ایک بھیلی۔ سینٹھ والے تالاب میں جا کر برسات کے سوا سارے برس میں خشک پڑا رہتا، چنے بکھیرے، بیچ میں گڑ کی بھیلی رکھی، ساتھ میں چھوٹے چھوٹے ڈنڈے۔ بندر کودتے پھاندتے آئے، چنے اناپ شناپ کھاتے۔ گالوں میں بھر لئے۔ بھیلی پہ لپکے۔ ایک بھیلی سو بندر، فساد شروع ہو گیا۔ ڈنڈے تو موجود ہی تھے۔ دیکھتے دیکھتے سب بندر لٹھ بند ہو گئے۔ جس نے بھیلی اٹھائی اسی کے سر پہ ڈنڈا پڑا۔

بندروں نے دنوں ہفتوں دھومیں مچائیں۔ شبخون، لوٹ مار اور بالآخر خانہ جنگی، اس کے بعد غائب۔ چھتیں پھر سنسان، منڈیریں پھر ویران۔ مگر جب بجلی آئی ہے ان دنوں وہ بستی میں تھے اور منڈیر منڈیر نظر آتے تھے۔ کھمبے کہ موسموں کے ستم سہتے سہتے منظر میں رل مل گئے تھے۔ اچانک پھر توجہ کا مرکز بن گئے۔ مزدور لمبی لمبی سیڑھیاں کاندھوں پہ اٹھائے نمودار ہوتے۔ کھمبوں کے اوپری سروں پر صلیبی انداز میں سلاخیں لگیں، سلاخوں میں سفید سفید چینی کی سی گٹکیں درست ہوئیں۔ ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک، دوسرے کھمبے سے تیسرے کھمبے تک تار تانے گئے اور سڑک سڑک کھمبوں پہ تار کھنچتے چلے گئے۔

فضا میں ایک نیا واقعہ ظہور پذیر ہو گیا تھا اور پرندوں کو نیچے ٹکانے کے لئے نئے ٹھکانے میسر آ گئے تھے۔ روپ نگر کے پرندے اب منڈیروں اور درختوں کی شاخوں کے محتاج نہیں رہے تھے۔ کوے منڈیروں پہ بیٹھے کائیں کائیں کرتے تھک جاتے تو وہاں سے اڑتے اور کسی تار پہ جھولنے لگتے۔ کوئی نیل کنٹھ، کوئی شاما چڑیا، کوئی دھوبن چڑیا۔ اڑتے اڑتے دم لینے کے لئے کسی تار پہ اتر آتی۔

پرندوں کی دیکھا دیکھی ایک بندر نے چھوٹی بزریا کی ایک منڈیر سے چھلانگ لگائی اور تاروں پہ جھول گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پٹ سے زمین پہ آ رہا۔ ایک طرف سے بھگت جی، دوسری طرف سے لالہ مٹھن لال اپنی دکان سے اٹھ کر دوڑے۔ حیرت اور خوف سے دم توڑتے بندر کو دیکھا۔ چلائے:

چندی نے لپک جھپک کنویں پہ جا ڈول ڈالا، پانی بھر کے لایا اور پورا ڈول بندر پہ انڈیل دیا مگر بندر کی آنکھیں بند اور بدن ساکت ہوتا چلا گیا۔

آس پاس کی منڈیروں پر جانے کہاں کہاں سے بندر امنڈ آئے تھے اور سڑک بیچ ساکت پڑے ہوئے اپنے رفیق کو دیکھ دیکھ کے شور مچا رہے تھے۔ پھر گلی محلوں سے لوگ دوڑے ہوئے آئے اور مرے ہوئے بندر کو حیرت سے تکنے لگے۔

"کون سے تار پہ لٹکا تھا؟"

"اس تار پہ" چندی سب سے اوپر والے تار کی طرف اشارہ کرتا۔

"تو بجلی آ گئی؟"

"ہاں جی آ گئی۔ ادھر آدمی نے تار کو چھوا اور ادھر ختم۔"

دوسرے دن پھر ایک بندر تاروں پہ کودا اور دھپ سے زمین پہ آ رہا۔ پھر بھگت جی اور لالہ مٹھن لال لپک کر وہاں پہنچے اور پھر چندی پانی سے بھرا ڈول لے کر دوڑا مگر بندر دیکھتے دیکھتے ٹھنڈا ہو گیا۔

بندروں میں پھر ایک کھلبلی پڑی۔ دور دور کی چھتوں سے کودتے پھاندتے آئے۔ بیچ سڑک پہ پڑے مردہ بندر کو ایک وحشت کے ساتھ دیکھا اور بساط بھر شور مچایا۔ بندر ہار تھک کر چپ ہو چلے تھے۔ بہت سے واپس ہونے لگے تھے کہ ایک موٹا تازہ بندر پنڈت ہر دیال کی اونچی لمبی منڈیر پہ دور سے دوڑتا ہوا آیا۔ غصے سے منہ سرخ، بال بدن پہ تیروں کی طرح کھڑے ہوئے۔ کھمبے پہ چھلانگ لگائی۔ کھمبے کو اس زور سے ہلایا کہ وہ بودے پیڑ کی طرح ہل گیا۔ پھر وہ اوپر چڑھا اور پوری قوت کے ساتھ تاروں پہ حملہ آور ہوا۔ تاروں پہ کودتے ہی لٹک گیا۔ گھڑی بھر لٹکا رہا، پھر ادھ موا ہو کے زمین پہ گر پڑا۔ بھگت جی، لالہ مٹھن لال اور چندی تینوں نے پھر اپنا اپنا فرض ادا کیا۔ بندر نے پانی پڑنے پہ آنکھیں کھولیں، بے بسی سے اپنے درد مندوں کو دیکھا اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

بندر چھتوں چھتوں کودتے پھاندتے آئے۔ لگتا تھا کہ سب سڑک پر اتر آئیں گے، مگر بس وہ منڈیروں پہ منڈلاتے رہے، چیختے چلاتے رہے پھر ایک دم سے چپ ہو گئے جیسے کسی خوف نے انہیں آلیا ہو۔ پھر منڈیریں خالی ہونے لگیں۔

شام ہو رہی تھی۔ موٹا بندر ابھی تک سڑک پہ پڑا تھا۔ آس پاس کی کسی منڈیر پہ کہیں کوئی بندر نہیں تھا۔ روپ نگر اپنے تین بندروں کی بھینٹ دے کر بجلی کے زمانے میں داخل ہو گیا اور بندر ایسے غائب ہوئے کہ ہفتوں تک کسی منڈیر، کسی چھت، کسی درخت پہ کوئی بندر دکھائی نہیں دیا اور تو اور کالے مندر کے بڑے پیپل پہ بھی، جہاں ہر موسم، ہر دنوں میں بندر شاخ شاخ اچکتے لٹکتے نظر آتے تھے، سناٹا تھا۔

روپ نگر کا جنگل اسی کالے مندر سے شروع ہوتا تھا۔ دیواروں اور گنبد پہ اتنی کائی جم گئی تھی اور جم کے کالی پڑ گئی تھی کہ پورا مندر کالا کالا دکھائی پڑتا تھا۔ اندر باہر سب سنسان جیسے صدیوں سے یہاں نہ سنکھ پھنکا ہو، نہ کسی پجاری نے قدم رکھا ہو۔ جتنا اونچا مندر تھا اتنا ہی اونچا اس کا پیپل جس کی ٹہنیوں پہ سدا بندر جھولتے رہتے سوائے ان دنوں کے جب ادھر کوئی لمبی رسی جیسی دم اور کالے منہ والا لنگور آنکلتا کہ اس کے دیکھتے ہی بندر غائب ہو جاتے۔ کالے مندر سے آگے کربلا تھی کہ سال میں ایک عاشورہ کے دن کے سوا ویران دکھائی دیتی جیسے سچ مچ کربلا ہو۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک ٹیلہ جس پہ عمارت کے نام ایک برجی کھڑی رہ گئی تھی اور قلعہ کہلاتی تھی۔ آگے راون بن بالکل اجاڑ۔ دور تک میدان ہی میدان جس کے بیچوں بیچ ایک بھاری برگد کا پیڑ کھڑا تھا۔ بستی سے نکل کر بندو اور حبیب کے ساتھ گرمی کی دوپہروں میں گھومتا پھرتا جب وہ اس طرف آنکلتا اور کالے مندر کی سرحد کو پار کر لیتا تو اسے لگتا کہ وہ کسی دوسرے براعظم میں داخل ہو گیا ہے۔ کسی بڑے جنگل میں جہاں پتہ نہیں کس گھڑی کس مخلوق سے مڈھ بھیڑ ہو جائے، اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔

کالے مندر والے بندروں سے شاد آباد پیپل سے گزرتے گزرتے وہ ٹھٹکا "یار،" اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"کیا ہے بے؟" حبیب نے بے پروائی سے پوچھا۔

"آدمی۔" اس نے ڈری ہوئی آواز میں کہا۔

"آدمی! کہاں؟" حبیب اور بندو دونوں ایک دم سے چونکے۔

"وہ۔" اس نے قلعے کی طرف انگلی اٹھائی جہاں ایک اکیلا آدمی چلتا نظر آرہا تھا۔

اس سنسان بن میں آدمی! کیوں؟ کیسے؟ آدمی ہی ہے یا ۔۔۔ مگر خود آدمی کے ہونے کا خوف بے پایاں تھا۔ بس وہ ایک دم سے الٹے پیروں بھاگ کھڑے ہوئے۔

بندو تو اسی گھر میں رہتا تھا کہ شریفن بوا کا پوت تھا۔ حبیب سے یارانہ تھا۔ دونوں کے ساتھ اس نے کتنی آوارہ گردی، کتنی دشت نوردی کی تھی۔ مگر صابرہ کے آنے کے بعد اس کی آوارہ گردی میں فرق پڑتا چلا گیا۔

صابرہ، پہلے تو اس نے اس کا صرف نام سنا تھا جب خالہ جان کا گوالیار سے خط آتا اور اس میں لکھا ہوتا کہ طاہرہ اور صابرہ اچھی ہیں۔ سب سلام کہتی ہیں۔ خالہ جان گوالیار میں رہتی تھیں کہ خالو جان، جو بی اماں کے بھتیجے تھے، وہیں ملازم تھے۔ مگر ایک دن تار آیا خالو جان کے دنیا سے اٹھ جانے کا۔ امی نے روٹی پکاتے پکاتے توا الٹ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بی اماں بین کر کر رو ئیں۔

بس اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد سامان اور سواریوں سے لدا پھندا اور چاروں طرف سے چادر سے تنا ہوا اکہ گھر کے پھاٹک کے سامنے آکر رکا۔ ابا جان ایک لمبی چادر لے کر باہر آئے۔ ایک کونا تانگے پکڑایا، ایک کونا خود پکڑا۔ ایک سمت میں تو اس طرح پردہ کیا۔ دوسری سمت میں کوئی آدمی چلتا پھرتا نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر اکے کا پردہ اٹھا۔ خالہ جان اتریں۔ خالہ جان کے ساتھ دو لڑکیاں، ایک طاہرہ باجی اور دوسری صابرہ جسے خالہ جان